

اہل تصوف اور دینی جدوجہد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دنیا میں بہت سی چیزیں بعض خاص اسباب کی بناء پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔ انہی مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف، تعطل و بے عملی حالات سے شکست خوردگی اور میدان جدوجہد سے فرار کا نام ہے، لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور تاریخی حیثیت سے بھی ہمیں اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔ سیرت سید احمد شہیدؒ میں تزکیہ و اصلاح باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے، جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین پیدا ہو گیا ہے:

”یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی و جان بازی، جہاد قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و خیر کے لئے جس روحانی و قلبی قوت، جس وجاہت و شخصیت، جس اخلاص و ولہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلہ اور ہمت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجتہد دانہ یا مجاہدانہ کا نام انجام دیئے ہیں، ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالیے، امیر عبدالقادر الجزارؒ، مجاہد جزائر، محمد احمد السودانی (مہدی سوڈانی) سید احمد شریف السوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے۔ حضرت سید احمد ایک مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت و ریاضات تزکیہ نفس اور قرب الہی سے عشق الہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر روکنے سے یہی آواز آتی ہے:

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اس لیے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوق شہادت ہے اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے“ (۱)

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہر ہیں جن سے جہاد و جدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات و مالومات مادی، مصالح و منافع، اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہو سکتا

ہے اور لکنہ اُخلد إلى الأرض واتبع هواہ (۲) کے دام ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی ”تقدیر سیما“ اور تجلیوں کی بے تاب پیدا کردی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جانبازی، بلکہ ہل تراہار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے، اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدہ کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی بارودش معلوم ہونے لگے۔ کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا:

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست اس نوید جاں فزا سے سروبال دوش ہے

اس لیے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقہٴ مجاہدین میں یقین و محبت کی یہی روح پھونک دی تھی اور اپنے یقین و محبت کو سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لیے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی اور شہادت کی موت آسان اور خوشگوار بنادی تھی اور ان کے لیے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا، جتنا دوسروں کے لیے مرنا مشکل تھا، یہی سر حلقہ وہ امام وقت ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر زین دوست زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے فخر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

معمولی و معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح و نصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں اس کے لئے کسی غیر معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن مایوس کن حالات اور قومی اختصار کی کیفیات میں صرف وہی مرد میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور قوت ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیتِ عشق کے مالک ہوں۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے کہ ظاہری علم و حواس و قوت مقابلہ نے جواب دے دیا اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہونے لگی تو کوئی صاحب یقین و صاحب عشق میدان میں آیا، جس نے اپنی ”جرات و رندانہ“ اور کیفیتِ عاشقانہ سے زمانہ کا بہتا ہوا دھار ابدل دیا اور اللہ تعالیٰ نے مُغْرَجُ الْحَيِّ مِنَ الْمَتِّبِ وَ مُخْرَجُ الْحَيِّ مِنَ الْحَيِّ وَالْمُخْبِرُ مِنَ الْأَرْضِ بِفَتْحِ مَوْفِقِ ط (۳) کا منظر دکھا دیا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا، جلال الدین خوارزم شاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا تو تمام عالم اسلام پر یاس و مردنی چھا گئی۔ تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی اور یہ مثال زبان و ادب کا جزو بن گئی کہ إذا قيل لك: إن انترا انتهم موافلا تصلقو ”اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو کبھی یقین نہ کرنا“، اس وقت کچھ صاحب یقین و صاحب قلب مردان خدا تھے جن کی مثال نہیں ہوتی اور اپنے کام میں لگے رہے

یہاں تک کہ تاری سلاطین کو مسلمان کر کے ضم خانہ سے کعبہ کے لیے پاسان مہیا کر دیئے۔

ہندوستان میں اکبر کے دور میں ساری سلطنت کا رخ الحاد و لادینیت کی طرف ہو گیا۔ ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پورے وسائل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لیے حاصل تھے۔ سلطنت میں ضعف و پیرانہ سالی کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی امید کی جاسکے۔ علم و ظاہری قیاسات کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے، اس وقت ایک درویش بے نوائے تن تھا اس انقلاب کا بیڑہ اٹھایا اور اپنے یقین و ایمان، عزم و توکل اور روحانیت و للہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیٹرو سے بہتر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اکبر کے خجہ سلطنت پر بالآخر محمدی الدین اور رنگ زیب نظر آیا۔ اس انقلاب کے بانی امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجددِ عالم تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی ”تاتاریوں“ یا مجاہدین صلیب کی پورش ہوئی تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردانِ کائرسے کفن باندھ کر میدان میں آئے وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے جن کے تزکیہ نفس اور سلوک راہِ نبوت نے ان میں دین کی حقیقت، کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کر دی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے، نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھے دیا۔ مغربی مورخین نے ان کی شجاعت، عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔ یہ مجاہد، ذوق و عملاً صوفی اور شیخ الطریقت تھا، امیر کلیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے :

”امیر عبدالقادر مرحوم پورے عالم وادیب، عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صوفی تھے، تصوف میں ان کی ایک کتاب ”المواقف“ ہے۔ وہ اس سلسلے کے یکتائے روزگار لوگوں میں سے تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہو سکے۔“ (۴)

دشمن کے زمانہ قیام کے معمولات و اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”روزانہ فجر کو اٹھتے، صبح کی نماز اپنے گھر کے قریب کی مسجد میں جو محلہ العمارہ میں واقع ہے، پڑھتے، سوائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان المبارک میں حضرات صوفیہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے، برابر سلوک و تقویٰ اور اخلاقی فاضلانہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔“ (۵)

۱۸۱۳ء میں طاعشان پر جب روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے لشکر بندی شیوخ تھے جنہوں نے علم جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات و مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے، امیر کلیب ارسلان لکھتے ہیں :

”اس جہاد کے علمبردار طاغستان (۶) کے علماء اور طریقہ نقشبندیہ کے (جو طاغستان میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہنچتا ہے، جو خطابات، عہدہ و اقتدار جمہوریت قیادت و سرداری، عیش و لذت اور تمنوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فردی کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سمجھ کر انہوں نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت مطہرہ کے مطابق ہونے کہ قوم کے قدیم جاہلی عادات کے، اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے، جن کو روسی قاضی ملا کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ علوم عربیت میں بلند پایہ رکھتے تھے، ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارے میں ان کی ایک تصنیف ”إقامة البرهان علی ارتداد عرفاء طاغستان“ (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔“

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے۔ ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبالی، جو بقول ”امیر کلیب“ امیر عبدالقادر الجزار کی کے طرز پر تھے اور مشیخت سے امارت ہاتھ میں لی تھی۔“
شیخ شامل نے ۲۵ برس تک روس سے مقابلہ جاری رکھا، اور مختلف معرکوں میں ان پر زبردست فتح حاصل کی، روس ان کی شوکت و شجاعت سے مرعوب تھے، اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بے دخل ہو گئے تھے، ۱۸۳۳ء اور ۱۸۳۴ء میں شیخ نے ان کے سارے قلعے فتح کر لیے اور بڑا جنگی سامان مالی غنیمت میں حاصل کیا، اس وقت حکومت روس نے اپنی پوری توجہ طاغستان کی طرف مبذول کی، طاغستان میں جنگ کرنے کے لیے باقاعدہ دعوت دی، شعراء نے نظمیں لکھیں اور پے در پے فوجیں روانہ کی گئیں، شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہد عظیم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

تصوف و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السوسی کی ہے، اٹالویوں نے بدعت و طرابلس کی فتح کے لیے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا، نوآبادیوں اور آبادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اٹالویوں کی نا تجربہ کاری ہے، اس مہم میں ممکن ہے تین مہینے لگ جائیں، لیکن نہ پندرہ دن نہ تین مہینے، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے، اور اٹالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پُرس نہ کر سکے، یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سید احمد الشریف السوسی کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اٹالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمائے نہیں دیا۔

امیر کلیب ارسلان نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامے نے ثابت کر دیا کہ طریقہ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں، جو سنوسی رکھتے ہیں۔ خود سیدی احمد الشریف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں

ان کے ناصیہ اقبال سے ہویدا ہے، ایک طرف اپنے تقویٰ و عبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانہ کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے دلیرانہ زمانہ کی صف میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔“

امیر ٹکلیب نے صحراء اعظم افریقہ کی سنوی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے، یہ خانقاہ واحد الکفرہ میں واقع تھی، اور سید احمد شریف کے چچا اور شیخ السید المہدی کے انتظام میں تھی، افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دارالتر بیت تھی، امیر مرحوم کہتے ہیں :

”سید مہدی صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے عملی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہ اپنے برادران طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہسواری، نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہے ان میں غیرت اور مستعدی کی روح پھونکتے، ان کو گھوڑ دوڑ اور سپہ گری کا شوق دلاتے رہے اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور مختلف مواقع پر اُس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے، خصوصاً جنگ طرابلس میں سنو سیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوت ہے، جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے، اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، صرف جنگ طرابلس ہی میں سنو سیوں کا جوش و غضب ظاہر نہیں ہوا، بلکہ علاقہ کانم اور وادی (سوڈان) میں وہ ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۳۲ھ تک فرانسیسیوں سے برسرِ جنگ رہے۔“

سیدی احمد الشریف نے مجھے سنایا کہ ان کے چچا سید مہدی کے پاس پچاس پچاس ذاتی بندوقیں تھیں، جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پونچھتے تھے، اگر چہ ان کے سینکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے، مگر وہ اس کے روادار نہ تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے، تاکہ لوگ ان کی اقتداء کریں، اور جہاد کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے سامان و ذخائر کا اہتمام کریں، جو کادان جنگی مشقوں کے لیے مخصوص تھا، گھوڑوں کی ریس ہوتی، نشانہ بازی کی مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ۔

خود سید ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے، شہسوارد و حصوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہو جاتے، اور دوڑ شروع ہوتی، یہ سلسلہ دن چھپے تک جاری رہتا کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا، اور نشانہ بازی شروع ہوتی، اس وقت علماء و مریدین کا نمبر نشانہ بازی میں بڑا ہوتا، کیونکہ ان کے شیخ کی ان کے لیے خاص تاکید تھی، جو لوگ گھوڑ دوڑ میں پالا جیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے، ان کو قیمتی انعامات ملتے تاکہ جنگی کمالات کا شوق ہو۔“

جمہرات کادان دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لیے مقرر تھا، اُس دن اسباق بند ہو جاتے، مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا، کہیں بخاری، کہیں لوہاری،

کہیں پارچہ بانی، کہیں دراتی کا مشغلہ نظر آتا، اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا، خود سید مہدی بھی پورے مشغول رہتے، تاکہ لوگوں کو عمل کا شوق ہو۔

سید مہدی اور ان سے پہلے ان کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا، اس کا ثبوت ان کی خانقاہیں، اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سنوئی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں، وہ نئے نئے قسم کے درخت دور دراز مقامات سے اپنے شہروں میں منگواتے تھے، انہوں نے کفرہ اور جنوب میں ایسی زراعتیں اور درخت روشتاس کئے، جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا، بعض طلبا سید محمد السوی (بانی سلسلہ سنوسیہ) سے کیسیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ ”کیسیا مل کے نیچے ہے“ اور کبھی فرماتے ”کیسیا کیا ہے ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ ہے۔“ وہ طلبا اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے، اور ایسے جملے فرماتے جن سے ان کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے، اور نہ ان میں علماء کے مقابلے میں احساس، کمتری پیدا ہوتا، چنانچہ فرماتے تھے: ”بس تم کو حسن نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں۔“ کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ وروں میں شامل کر کے، اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے:

”کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور سمیجوں والے (ذاکرین و صوفیہ) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے، نہیں خدا کی قسم! وہ ہم سے کبھی سبقت نہیں لے جاسکتے۔“ (۷)

عالم اسلام پر سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئے دنیائے اسلام کے معماروں میں ہیں، سید جمال الدین افغانی سر تا پا دعوت و عمل اور ایک شعلہ بخولا تھے جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک تمام عالم اسلام میں حمیت اسلامی کی روح اور اتحاد اسلامی کا تصور پھونکا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے سوزدروں اور گرمی نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں ان کے ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو بھی دخل ہے، جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت اور مخالفتوں اور مایوس کن حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کر سکتا، یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچہ سے واقف تھے۔ (۸)

معاصر دینی تحریکوں میں ”الاخوان المسلمون“ کی تحریک سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تحریک ہے اور عالم عربی کے لیے تو وہ احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی واحد تحریک ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے پورا ربط ہے اور ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے، اس کے بانی شیخ حسن البنا مرحوم کی شخصیت بڑی مؤثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ سر تا پا عمل اور مجتہد جدوجہد تھے، نہ ٹھکنے والے، نہ مایوس ہونے والے، نہ پست ہونے والے سپاہی اور داعی تھے، ان کی ان خصوصیات میں ان کے روحانی نشوونما اور سلوک کو بڑا دخل

ہے۔ وہ جیسا کہ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں تصریح کی ہے طریقہ حصابیہ شاذیہ میں بیعت تھے، اور باقاعدہ اس کے اذکار و اشغال کی ورزش کی تھی۔ (۹)

ان کے خواص اور معتمدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اوراد و معمولات کے پابند رہے، اخوان کی پانچویں موتمر ۱۳۶ھ میں انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے :

”ایک ایسی جماعت جس میں سلف کی دعوت، اہل سنت کا طریقہ، تصوف کی حقیقت، سیاست، ورزش، علم و ثقافت، اقتصادی تعاون اور اجتماعی فکر جمع ہیں۔“ (۱۰)

ہندوستان میں تصوف و جہاد کا ایسا عجیب امتزاج و اجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دور دور ملنی مشکل ہے، اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے اور حد تو اترا کو پہنچ چکی ہے، ان کے رفقاء جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغض فی اللہ کے واقعات فُرد و انفرادی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے، تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرن اوّل کا ایک بچا ہوا ایمانی جھونکا تھا جو تیرہویں صدی میں چلا تھا۔ (۱۱) اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہِ نبوت کی تربیت و سلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے، اور بغیر صحیح روحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش و جذبہ اور ایثار و قربانی اور جاں سپاری کی امید غلط ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی سید صاحبؒ کے پر توتھے، ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حدیثیوں کے جامع تھے، ایک طرف ان کے جہاد و اہتمام اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ کرتے ہیں اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی انبالہ کے چھانی گھر میں، اور کبھی جزیرہ انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلہ مجددیہ و سلسلہ محمدیہ (سید صاحبؒ کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

در کئے جام شریعت در کئے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان بافتن

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلاڑے میں رکھی جائیں اور اہل صادق و پوری جدوجہد اور قربانیاں دوسرے پلاڑے پر شاید یہی پلاڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد، دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے، شامی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامنؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہم) انگریزوں کے خلاف صف آراء نظر آتے ہیں، حضرت حافظ ضامنؒ وہیں شہید ہوتے ہیں، حضرت حاجی صاحبؒ کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑتی ہے، مولانا نانوتویؒ و مولانا گنگوہیؒ کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔ پھر مولانا محمود حسن دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ

الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو، ان کی بلند ہستی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلہ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، ریشمی خطوط اور انور پاشا کی ملاقات، مالٹا کی اسارت، ان کی اعلیٰ ہستی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَلُُّوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝ (سورۃ الاحزاب ۳۳:۲۳) ”ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں

نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انہوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔“ (۱۲)

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تعطل و بے عملی، حالات کے مقابلے میں سپرد اندازی اور پسپائی تہذوف کے لوازم میں سے ہے اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند مصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ائمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں بھی اوّل الذکر اصحاب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر تہذوف اپنی صحیح روح اور سلوک راہِ نبوت کے مطابق ہو، اور یقین و محبت پیدا ہونے کا باعث ہو (جو اس کے اہم ترین مقاصد و نتائج ہیں) تو اس سے قوت و عمل، جذبہ جہاد، عالی ہستی، جفاکشی، شوق شہادت پیدا ہونا لازمی ہے، جب جب الہی کا چشمہ دل سے اُبلے گا، تو روئیں روئیں سے یہ صد بلند ہوگی:

اے آنکہ زنی دم از محبت
بر خیز و بہ تیغ تیز بنشین
از ہستی خویش من پرہیز
یا از رو راہ دوست بر خیز

☆.....☆.....☆

حوالہ جات

- (۱) سیرت سید احمد شہید طبع ثانی (۲) سورۃ الاعراف ۱۷۶:۷ (۳) سورۃ الروم ۱۹:۳۰ (۴) حاضر العالم الاسلامی جلد دوم ۱۷۳
- (۵) حاضر العالم الاسلامی جلد دوم ۱۷۴ (۶) ملاحظہ! بحرِ فرس سائل پر اسلامی آبادی کا ایک ملک ہے۔ اگر شمالی تقعا ذکر اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۳۰۰ لاکھ درمیان آبادی ہوگی۔ ۱۵۰ھ میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیرِ اثر تھا۔ (۷) حاضر العالم الاسلامی ج ۲ صفحہ ۱۶۳ تا ۱۶۴ (۸) مجھ سے قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل و معصف ذاکر احمد امین نے خود اس کا تذکرہ کیا، جنہوں نے ان کا زمانہ پایا تھا اور شیخ محمد عیدہ کے درس میں شریک ہوئے تھے۔ (۹) ملاحظہ ہو ”نذاکرات الدعوة والداعیہ“ جو خود ان کی تصنیف ہے۔ (۱۰) رسالہ الموت الرحیل ص ۱۸، ۱۹۔ (۱۱) ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ”جب ایمان کی بہار آئی“ (۱۲) بیان القرآن ۱۴ آیات۔

